جاوید احمد غامدی

بیمہ

بیمہ یا انشورنس ایک نوعیت کا عقد معاونت ہے جس میں لوگ ایک متعین رقم بالاقساط اِس لیے ادا کرتے ہیں کہ اُن میں سے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان پہنچے تو لوگوں کی جمع شدہ رقوم سے ایک مقررہ قاعدے کے مطابق اُس کے نقصان کا ازالہ کر دیا جائے۔ یہ رقوم کبھی واپس نہیں کی جاتیں، بلکہ جو افراد یا ادارے یہ ذمہ داری اٹھاتے ہیں، اُنھیں اِس عقد معاونت کے شرکا یہ حق بھی دیتے ہیں کہ اپنی اِس خدمت کے معاوضے میں اُن کی جمع شدہ رقوم کو وہ جس طرح چاہیں، استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ ایک غیر معمولی اسکیم ہے جو نقصان کے ازالے اور مشکل حالات میں لوگوں کی معاونت کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ اِس کی افادیت اب ہر جگہ تسلیم کی جاتی ہے۔ قبیلہ، برادری اور عاقلہ کا نظم ختم ہو جانے کے بعد یہ ایک بہترین متبادل ہے جو دور حاضر کی معیشت نے دنیا کو فراہم کیا ہے۔ اِس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن علما بالعموم اِسے حرام قرار دیتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جو اعتراضات اِس اسکیم پر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ بیمہ کے ادارے کسی نقصان کی صورت میں جو رقم ادا کرتے ہیں، وہ اداشدہ قسطوں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سود ہے اور سود اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔ پھر یہ ادارے آگے بھی اپنے اموال سودی کاروبار میں لگاتے ہیں جس کا کچھ نہ کچھ حصہ اُن لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جنھیں ازالۂ نقصانات کے لیے رقوم ادا کی جاتی ہیں۔

۲۔ بیمہ کرانے والے بارہا معمولی رقم کے عوض موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں۔ یہ جوا ہے اور جوا بھی اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔

۳۔ بیمہ جس چیز کے لیے کیا جاتا ہے، اُس کا وجود متحقق نہیں ہوتا، محل عقد بھی غیر واضح ہوتا ہے اور بیمہ کرانے

والے یہ بھی نہیں جانتے کہ اُنھیں کب تک اور کتنی اقساط دینا پڑیں گی۔ فقہا کی اصطلاح میں یہ تینوں چیزیں بالترتیب غرر، غبن اور جہالت کہلاتی ہیں جن کے ساتھ کوئی معاہدہ جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح کے معاہدات سے منع فرمایا ہے۔

یہ تینوں اعتراضات، اگر غور کیجیے تو بالکل بے بنیاد ہیں۔

پہلا اِس لیے کہ بیمہ میں جو رقوم بالاقساط ادا کی جاتی ہیں، وہ کوئی قرض نہیں ہوتیں۔ اپنی معاونت کے وعدے پر وہ دوسروں کی معاونت کے لیے دی جاتی ہیں، لہٰذا کبھی واپس نہیں لی جاتیں۔ بیمہ کے ادارے اُنھیں سودی کاروبار میں لگاتے ہیں تو اپنے حق استعمال کی بنا پر لگاتے ہیں۔ اِس کی کوئی ذمہ داری بیمہ کرانے والوں پر عائد نہیں ہوتی۔ بیمہ جس معاملے کے لیے کرایا جاتا ہے، وہ پیش آ جائے تو جو کچھ ملتا ہے، معاہدے کی رو سے دوسروں کی جمع شدہ رقوم سے ملتا ہے۔ بیمہ کی حقیقت یہی ہے اور اِسے اِسی لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔

دوسرا اِس لیے کہ جوا ایک کھیل اور نری قسمت آزمائی ہے۔ اِس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، وہ ازالۂ نقصانات کے لیے ایک دوسرے کی معاونت کا کوئی نظم قائم کرنے کے لیے شریک نہیں ہوتے۔ دونوں کی حقیقت الگ ہے اور دین کے احکام ادنیٰ مماثلت پر نہیں، بلکہ اشیا کی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور اِسی پر مبنی ہونے چاہییں۔

تیسرا اِس لیے کہ غرر، غبن اور جہالت سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سد ذریعہ کے طور پر اور بیع و شرا میں رفع نزاعات کے لیے ہیں۔ بیمہ بیع و شرا کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ باہمی تعاون کی ایک اسکیم ہے جس کا اہتمام کرنے والے افراد اور اداروں کو اُن کی خدمت کے معاوضے میں جمع شدہ رقوم کو استعمال کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ اِس کی اِس حقیقت کو نظر انداز کر کے اِس پر کوئی حکم لگانا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا
عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ

ہم اِس بات سے واقف رہے ہیں[۳۷] کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں،[۳۸] اُس سے تمھیں رنج ہوتا ہے۔ (ایسا نہیں ہونا چاہیے)، اِس لیے کہ یہ تمھیں نہیں جھٹلا رہے، یہ ظالم تو آیات الٰہی کا انکار کر رہے ہیں[۳۹]۔ تم سے پہلے بھی رسولوں کو (اِسی طرح) جھٹلایا گیا تھا تو اپنی تکذیب اور اپنی اذیتوں پر اُنھوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد اُنھیں پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور (ہماری اِس سنت کو سمجھنے کے لیے)

۳۷؎ اصل میں 'قَدْ نَعْلَمُ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ درحقیقت 'قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ' ہے۔ مضارع پر جب اِس طرح 'قَدْ' آتا ہے تو اِس میں فعل ناقص عربیت کے قاعدے پر محذوف ہوتا ہے۔ یہاں اِس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ یہ بات برابر ہمارے علم میں رہی ہے اور ہے۔

۳۸؎ یہ اُنھی مطالبات کا ذکر ہے جو پیچھے بیان ہو چکے ہیں اور آگے بھی بیان ہوں گے۔

۳۹؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین اور تسلی کے لیے یہ نہایت دل نواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے

جَآءَكَ مِنۡ نَّبَاِی الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۳۴﴾

وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِیَ نَفَقًا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ وَالۡمَوۡتٰى

پیغمبروں کی کچھ سرگذشتیں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں[۴۰]۔ ۳۳-۳۴

اِن کا اعراض اگر (اِس کے باوجود) تمھیں گراں گزر رہا ہے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈ لو کہ اِن کے پاس کوئی نشانی لے آؤ[۴۱]۔ اللہ چاہتا تو اِن سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، اِس لیے جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو[۴۲]۔ (ہماری اِس دعوت کو)

کوئی بات لے کر نہیں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمارا کلام اور ہماری کتاب ہے جو ہمارے حکم سے اور ہماری ہدایت کے مطابق اِن کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اگر جھٹلا رہے ہیں تو تم کو نہیں، بلکہ ہمیں جھٹلا رہے ہیں۔ اِس لیے معاملے کو ہم پر چھوڑو، اِن ظالموں سے ہمیں نمٹیں گے۔

۴۰؎ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام اور اُن کے پیرووں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انبیا اور اُن کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست مدد سے ہم کنار ہونے کے لیے ابتلا و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اِس دوران میں اِن انبیا کی قوموں کی طرف سے برابر اِن کی تکذیب ہوتی ہے۔ اِن کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے اِن کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی ابھر کر باہر آ جاتا ہے اور جو جوہر نبی اور اُس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے، وہ بھی نکھر کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرین حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور اُن کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ اُن کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام رسولوں کی سرگذشتیں اِس سنت اللہ پر شاہد ہیں۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۴۴)

۴۱؎ اِس جملے میں جواب شرط محذوف ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ ترجمے میں ہم نے اُسے

یَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۶﴾

وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡهِ اٰیَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۷﴾ وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ

وہی قبول کریں گے جو سننے والے ہیں۔ رہے یہ مردے تو (اِن کا انجام اب یہی ہے کہ) اللہ اِنھیں اٹھائے گا، پھر یہ اُس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔۳۵-۳۶

کہتے ہیں کہ اِس نبی پر اِس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟[۴۳] کہہ دو: اللہ پوری قدرت رکھتا ہے کہ (جب چاہے) کوئی نشانی اتار دے، مگر اِن میں سے اکثر (یہ مطالبہ اِس لیے کرتے ہیں کہ بعض حقائق سے) واقف نہیں ہیں۔[۴۴] (دیکھتے نہیں ہو کہ) زمین پر جتنے جانور (اپنے

کھول دیا ہے۔

۴۲؎ مطلب یہ ہے کہ دنیا علم و عقل اور ارادہ و اختیار کے امتحان کے لیے بنی ہے۔ اللہ یہ کرسکتا تھا کہ بالجبر لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا یا کوئی ایسی صورت پیدا کرتا کہ سارے حجاب دور ہو جاتے اور لوگ حقیقت کو بچشم سر دیکھ لیتے، لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس کی اسکیم یہی ہے کہ لوگ اِس امتحان سے گزر کر کامیاب یا ناکام ہوں۔ لہٰذا اِن کے ایمان کی آرزو میں اِس طرح جذبات سے مغلوب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سنت الٰہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جذبات کوئی جذبات نفس نہیں تھے، بلکہ سراسر جذبات خیر تھے، مگر حد مطلوب سے بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک دیا۔ آیت میں بظاہر عتاب ہے، لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز ہے۔ اِس میں اگر کوئی تلخی ہے تو اُس کا رخ اُنھی بدبختوں کی طرف ہے جن کے ایمان کے لیے آپ اِس قدر بے تاب تھے۔

۴۳؎ آگے کی آیات سے بتدریج واضح ہو جائے گا کہ یہ مطالبہ کسی ایسی نشانی کے لیے تھا جو یہ ثابت کر دے کہ اگر یہ لوگ پیغمبر کی تکذیب پر قائم رہے تو اِن پر عذاب آجائے گا۔

۴۴؎ اِس اجمال میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اِس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ اِن کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، حالاں کہ یہ نشانی اگر ظاہر ہو گئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔

بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ مَا فَرَّطۡنَا فِي الۡكِتٰبِ مِنۡ شَيۡءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمۡ
يُحۡشَرُوۡنَ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكۡمٌ فِي الظُّلُمٰتِ مَنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ

پاؤں سے چلتے ہیں) اور (فضا میں) جتنے پرندے اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں[۴۵]، سب تمھاری ہی طرح امتیں ہیں اور (سمجھانے کی حد تک تو) ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے[۴۶]۔ اِس کے بعد (یہی باقی ہے کہ ایک دن) یہ اپنے پروردگار کے حضور میں اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ ہماری آیتوں کو جن لوگوں نے جھٹلانے کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے

دوسری یہ کہ یہ خدا کی اُس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور اُن کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے، بلکہ وہ اُن کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں اُن پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے، تب خدا اُن کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر اُن کو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں، حالاں کہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اِس وجہ سے کہ اُس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے، لیکن اِس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدقسمت لوگ اُس رحمت سے ناآشنا ہیں جو اِس مہلت کے اندر مضمر ہے، بشرطیکہ اُس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اُس وقت تک کھلے رکھتا ہے، جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود اُن کو اپنے اوپر بند نہ کرلیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۷)

۴۵؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ'۔ اِن میں مقابل کے بعض الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ مثلاً جملے کے پہلے حصے میں 'فِي الۡاَرۡضِ' ہے تو دوسرے حصے میں 'فی السماء' کا لفظ نہیں آیا۔ اِسی طرح دوسرے حصے میں 'يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ' کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں 'تدب علی رجلیها' یا 'ارجلها' کے الفاظ محذوف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اُنھیں کھول دیا ہے۔

۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو، دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ پھر قرآن میں بھی ہم نے اِن حقائق کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیوں سے تو صحیفۂ عالم بھی بھرا ہوا ہے اور صحیفۂ قرآن بھی، لیکن جو کسی بات کو سمجھنے کے

يُضِلِّلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴿۳۹﴾

ہیں۔(حقیقت یہی ہے کہ) اللہ (اپنے قانون کے مطابق[۷۴]) جسے چاہتا ہے، گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔۳۷-۳۹

لیے تیار ہی نہ ہوں، اُن کا کیا کیا جائے؟

آیت میں 'اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ' کے الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ یہاں جانوروں اور پرندوں کی زندگی کے جس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنا مقصود ہے، وہ اُن کا نظم اجتماعی ہے۔ اِس کی ایک بہترین مثال شہد کی مکھی اور چیونٹی کا اجتماعی شعور ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِن کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ اِن کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی انتھک سرگرمی ہے، رہایش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔''

(تدبرقرآن ۳/۴۸)

یہ اجتماعی شعور کسی نہ کسی درجے میں تمام جانوروں اور پرندوں میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی مخلوقات کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے وجود پذیر نہیں ہوئیں، بلکہ ایک غایت ہے جس کو سامنے رکھ کر تخلیق کی گئی ہیں۔ یہ غایت ہر فرد نوع کی انفرادی زندگی سے بھی سمجھی جا سکتی ہے، لیکن اجتماعی زندگی کے لیے جب یہ جوڑے کا انتخاب کرتے، خاندان بناتے، دوسرے خاندانوں سے متعلق ہوتے اور اپنے بقا و تحفظ کا اہتمام کرتے ہیں تو اِس کا ظہور ایسا واضح ہوتا ہے کہ انسان کی عقل مفلوج نہ ہو گئی ہو تو کبھی اِس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ چیز کسی اندھے بہرے قانون فطرت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اِس کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اِس کے بعد بھی نہیں سمجھتے ہو کہ اِس کے پیچھے ایک خالق و مدبر کا ہاتھ ہے اور یہ کائنات مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور تمھارے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، بلکہ اُسی وحدہ لاشریک خالق و مدبر کے علم و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی جلوہ گاہ ہے۔

۷۴؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ ہدایت وہی پائیں گے جو اپنے طرز عمل کی بنا پر اُس کے مستحق ہوں گے اور جو

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ
وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ
يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا

اِن سے کہو: ذرا بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا قیامت کی گھڑی آ پہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم (اپنے دعووں میں) سچے ہو؟ (نہیں)، بلکہ (ایسے ہر موقع پر) اُسی کو پکارتے ہو۔ پھر وہ چاہے تو اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے جس کے لیے پکارتے ہو اور اپنے (ٹھیرائے ہوئے) شریکوں کو (اُس وقت) تم بالکل بھول جاتے ہو۔[۴۸] ۴۰-۴۱

تم[۴۹] سے پہلے بھی ہم نے بہت سی قوموں کی طرف اپنے رسول بھیجے اور اُنھیں مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ عاجزی اختیار کریں۔[۵۰] پھر جب ہماری طرف سے سختی آئی تو اُنھوں نے کیوں عاجزی اختیار نہ کی؟[۵۱] بلکہ اُن کے دل (اور بھی) سخت ہو گئے اور شیطان نے اُن کے لیے (اُن کے) اُس عمل کو خوبی بنا کر

غلط روی پر اصرار کریں گے، وہ اُسی کے حوالے کر دیے جائیں گے، پھر کبھی راستہ نہ پا سکیں گے۔

۴۸؎ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو بڑے طنطنے کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، لیکن وہ آ پہنچا تو اپنے سب شریکوں کو بھول جاؤ گے اور اُسی ایک خدا کو پکارو گے جس کے شریک ٹھیرا رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ نفس انسانی میں صرف اُس کی شہادت ثبت ہے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ جب زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آتا ہے جو اصل آزمایش کا ہوتا ہے تو اپنے تمام فرضی معبودوں کو بھول کر اُسی کو پکارتے ہو۔

۴۹؎ یہاں سے آگے اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جس کے تحت رسولوں کے مکذبین ہلاک کر دیے گئے۔ اِس سے مقصود قریش کو توجہ دلانا ہے کہ جن قوموں نے عذاب کی نشانی کا مطالبہ کیا ہے، اُنھیں کبھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ملی، بلکہ جس عذاب کا مطالبہ وہ کر رہے تھے، اُسی نے اُن کی جڑ کاٹ دی۔

عَلَيۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَيۡءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوۡا بِمَآ اُوۡتُوۡٓا اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ
مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۵﴾
قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ

پیش کر دیا جو وہ کر رہے تھے۔ پھر جس چیز سے اُنھیں یاد دہانی کی گئی تھی، جب اُنھوں نے بھلا دی[۵۲] تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے اُن پر کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ہماری اُن بخششوں پر اترانے لگے جو اُن پر کی گئی تھیں تو اچانک ہم نے اُنھیں پکڑ لیا، اب حال یہ تھا کہ بالکل ششدر ہو کر رہ گئے۔ اِس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی[۵۳] جنھوں نے (اپنی جان پر) ظلم ڈھایا تھا اور شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو عالم کا پروردگار ہے (کہ اُس نے زمین کو اِن ظالموں سے پاک کر دیا)[۵۴]۔ ۴۲-۴۵

اِن سے پوچھو: کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ تمھاری سماعت و بصارت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں

۵۰؎ اصل میں لفظ 'تَضَرُّع' آیا ہے۔ یہ قرآن کی خاص تعبیر ہے جو دل کی خشیت اور انابت و عبدیت کے احساس کے ساتھ خدا کے آگے جھک جانے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

۵۱؎ یہ حسرت و افسوس کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی سے مقصود تو تنبیہ تھی، مگر کتنے بدقسمت تھے یہ لوگ کہ متنبہ ہونے کے بجاے اور سرکش ہو گئے۔

۵۲؎ یعنی اُن مصائب و آلام سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جن میں مبتلا کیے گئے تھے، بلکہ اُنھیں بھلا کر بالکل نچنت ہو گئے۔

۵۳؎ یہ نہایت لطیف تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس سے پہلے اِس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں، اُن سے اُن کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، اُن کی جڑ محفوظ رہتی ہے، لیکن جب یہ وقت آ جاتا ہے تو خدا اُن پر عذاب بھیجتا ہے جو اُن کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۵۲)

۵۴؎ یہ اُس احساس کا اظہار ہے جو خدا سے سرکشی کرنے والوں کے انجام پر ہر بندۂ مومن کے دل میں پیدا ہونا چاہیے۔

اِلٰـهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ
اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا
كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اُسے واپس لا دے گا؟[۵۵] دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے (اُن کے سامنے) پیش کر رہے ہیں، پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں۔ پوچھو: کبھی سوچا ہے کہ اگر اللہ کا عذاب[۵۶] تم پر اچانک آدھمکے یا ہانکے پکارے آئے تو کیا ظالموں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا؟ رسولوں کو تو ہم صرف اِس لیے بھیجتے ہیں کہ (لوگوں کے لیے) خوش خبری دینے والے اور (اُنھیں) خبردار کرنے والے ہوں۔[۵۷] سو جنھوں نے مان لیا اور اصلاح کر لی تو اُنھیں کوئی اندیشہ اور کوئی غم نہ ہوگا۔ (اِس کے برخلاف) جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، اُن کی نافرمانیوں کی پاداش میں (ہمارا) عذاب اُنھیں پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

۵۵؎ مطلب یہ ہے کہ یہی وقت ہے کہ اِن قوتوں سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے یہ دی گئی ہیں۔ اگر اللہ نے اِنھیں سلب کر لیا تو دوبارہ کہاں سے حاصل کرو گے؟ اِس کے بعد تو صرف حسرتیں باقی رہ جائیں گی۔

۵۶؎ اِس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے اور صرف اُنھی کو ہلاک کرتا ہے۔ اہل ایمان اُس سے لازماً بچا لیے جاتے ہیں۔

۵۷؎ یعنی وہ عذاب لانے یا معجزے دکھانے کے لیے نہیں بھیجے جاتے جس کا مطالبہ تم شب و روز کرتے ہو، بلکہ انذار و بشارت کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے مضمرات کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اِس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب اُن کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں، بلکہ اُن کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہیے

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر): میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے کی جاتی ہے۔[۵۸] کہہ دو: (میرا سوال صرف یہ ہے)، کیا اندھے اور دیکھنے والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟[۵۹] ۵۰

وہ چیز چاہیے جس کے لیے وہ آتے ہیں، یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ خوارق وعجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ اُن کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے، بلکہ اِن کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اِس میں رسول کے لیے پیام تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت —— بشارت اور انذار —— سے رکھے، جو باتیں اُس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں، اُن کو خدا پر چھوڑے، بلا وجہ اُن کے لیے پریشان نہ ہو۔‘‘

(تدبر قرآن ۳/ ۵۴)

۵۸؎ مطلب یہ ہے کہ بحث کرنی ہے تو اُس چیز پر کرو جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں غیب نہیں جانتا یا فرشتہ نہیں ہوں، اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میری بحث کا موضوع اِن میں سے کوئی چیز کبھی نہیں رہی۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو وحی کے ذریعے سے مجھے کہنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

۵۹؎ یعنی سمع و بصر کی صلاحیتوں سے کام لینے والوں اور آنکھیں بند کر کے زندگی بسر کرنے والوں کا انجام خدا کے ہاں الگ الگ ہوگا یا دونوں برابر ہو جائیں گے؟ میں تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم اِس بات پر غور کیوں نہیں کرتے؟

[باقی]

طالب محسن

بہترین نیکی

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ (رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ)، قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَیُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: إِيمَانٌ بِاللّٰهِ، قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: الْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، قَالَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: حَجٌّ مَبْرُوْرٌ.

وَفِیْ رِوَايَةِ مُحَمَّدِ بْنِ جَعْفَرَ، قَالَ: اِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ.

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کون سا عمل بہترین ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ پر ایمان، پوچھا گیا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد، پوچھا گیا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: بہترین طریقے پر کیا ہوا حج؟

محمد بن جعفر کی روایت میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول کا بھی ذکر ہے۔

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَیُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَالْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِهِ، قَالَ: قُلْتُ: أَیُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟ قَالَ:

أَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا وَأَعْلَاهَا ثَمَنًا، قَالَ: قُلْتُ: فَإِنْ لَّمْ أَفْعَلْ؟ قَالَ: تُعِيْنُ صَانِعًا أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ، قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ، أَرَأَيْتَ إِنْ ضَعُفْتُ عَنْ بَعْضِ الْعَمَلِ؟ قَالَ: تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ، فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنْكَ عَلٰى نَفْسِكَ.

حضرت ابو ذر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یارسول اللہ، کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ پر ایمان اور اللہ کی راہ میں جہاد، کہا: پھر میں نے پوچھا: کون سا غلام آزاد کرنا بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: جو مالکوں کے نزدیک سب سے بہتر ہو اور قیمت میں سب سے بڑھ کر ہو، کہا: میں نے پوچھا: اگر میں یہ نہ کر سکا؟ آپ نے فرمایا: تو کسی کام کرنے والے کی مدد کر دو یا کسی کام نہ جاننے والے کا کام بنا دو، کہا: میں نے پوچھا: یارسول اللہ، اگر میں ان میں سے کسی عمل میں کمزور رہا تو؟ آپ نے فرمایا: اپنے شر کو دوسروں سے روک لو، یہ تمھارا اپنی ذات پر صدقہ ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ لِوَقْتِهَا، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَمَا تَرَكْتُ أَسْتَزِيْدُهُ إِلَّا إِرْعَاءً عَلَيْهِ.

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا عمل بہترین ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت پر نماز، کہا: پھر میں نے پوچھا: پھر کون سا؟ حضور نے فرمایا: والدین سے نیکی، کہا: میں نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد، پھر میں نے یہ سوچ کر کہ بار خاطر نہ ہو مزید جاننے کے لیے سوال کرنے چھوڑ دیے۔

لغوی مباحث

'أی الأعمال أفضل': کون سا عمل بہترین ہے؟ یہ سوال اس فطری تصور پر مبنی ہے کہ تمام اعمال برابر نہیں ہو سکتے۔ کسی عمل پر زیادہ اجر ملے گا اور کسی پر اس کی نسبت سے کم۔ چنانچہ وہ آدمی جو زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لیے کوشاں ہے، یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اللہ کے نزدیک زیادہ بڑے اعمال کون سے ہیں تاکہ وہ انھیں اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ اجر کا مستحق بنے۔ یہ سوال دین کے اصل رخ کو جاننے میں بھی اہم ہے، اس لیے کہ دین میں وہی اعمال سب سے زیادہ قیمتی ہوں گے جو اس دین کے مجموعی مقصد کے حوالے سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوں گے۔

'صانع'، 'أخرق': 'صانع' اور 'أخرق' کے الفاظ یہاں متضاد کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں۔ 'صانع' کا لفظ اس شخص کے لیے مناسب ہے جو کسی ہنر سے واقف ہو، جبکہ 'أخرق' کا لفظ اس سے بالکل الٹ معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی ایسا شخص جو کوئی کام نہ جانتا ہو۔ ان الفاظ میں 'أو' کے لفظ سے واضح ہے کہ حضور نے یا 'صانع' کی مدد کے لیے کہا تھا یا 'أخرق' کی مدد کے لیے۔ بہرحال کوئی بھی صورت ہو، یہ لوگوں کے بارے میں خیر خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین ہے۔

معنی

ان روایات میں ایک ہی سوال ہے جو مترادف اسالیب میں کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ان میں جو جواب نقل ہوا ہے، وہ کچھ پہلوؤں سے مختلف اور کچھ پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے۔

پہلی روایت میں آپ نے اعمال اس ترتیب سے بیان کیے ہیں:

ایمان باللہ

جہاد فی سبیل اللہ

حج مبرور

اس سے اگلی روایت میں حج کا ذکر نہیں ہے۔ تیسری روایت میں وقت پر نماز، والدین سے نیکی اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ غرض یہ کہ اس روایت اور پہلی دونوں روایتوں میں جہاد کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اس سے اگلی روایت میں صرف نماز اور جہاد کا ذکر ہے۔ پھر ایک روایت میں نماز اور والدین کے ساتھ نیکی کا ذکر ہے۔ ان روایات میں سے ایک روایت میں ''غلام آزاد کرنے کی سب سے بہتر صورت کیا ہے؟'' کا سوال بھی منقول ہے۔

اسی روایت میں سائل نے پوچھا: اگر میں یہ نہ کر سکوں تو آپ نے کہا: کسی کی کام میں مدد کرو۔ سائل نے پھر پوچھا کہ اگر میں کمزور نکلوں تو آپ نے اسے اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی تلقین کی۔

ان روایات کے بارے میں ایک سوال تو یہ ہے کہ جوابات میں فرق کیوں ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اعمال کی ترتیب بھی کسی معنی پر دلالت کرتی ہے؟

عام طور پر شارحین نے فرق کی توجیہ مخاطب کے فرق سے کی ہے۔ یہ توجیہ بھی درست ہے، اس لیے کہ یہ بالکل فطری بات ہے کہ مخاطب کی رعایت سے بات کہی جائے۔ دوسری روایات سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں مخاطب کے لحاظ سے فرق کیا ہے یا ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اس کی تفصیل میں مخاطب کی شخصیت کو ملحوظ رکھا ہے، لیکن اس فرق کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، یعنی دین کے اعمال فکری پہلو سے ایک ترتیب رکھتے ہیں اور عملی پہلو سے ایک اور ترتیب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دین و اخلاق اور ایمان و عمل کے پہلو سے بھی ترتیبیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ بالکل ممکن ہے کہ حضور نے جواب دیتے ہوئے مختلف پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیے ہوں۔ ہم یہاں روایات کی ترتیب بیان پر بہت اعتماد نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس میں راویوں کے سبب سے فرق واقع ہو سکتا ہے۔ ہم جب قرآن مجید کو اس حوالے سے دیکھتے ہیں تو جہاد اور ہجرت کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح ایمان کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت بر میں ظاہری دین داری کے مظاہر کی نفی کے بعد ایمانیات اور ایمانیات کے بعد خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہوا ہے، پھر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد عہد کی پاس داری اور آخر میں ثابت قدمی کا ذکر ہے۔ جہاں بہترین اہل ایمان کا ذکر ہوا ہے، وہاں اعمال کے بیان میں نماز کو پیش و عقب میں رکھتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرنے، شرم گاہوں کی حفاظت، امانت داری اور وعدہ وفائی کو نمایاں ترین اعمال کی حیثیت دی گئی ہے۔ اسی طرح جہاں صفات کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہاں مثلاً آل عمران میں صبر، صدق، قنوت، انفاق اور سحر گاہی کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ پھر سورۂ احزاب میں اسی اسلوب کی آیت ہے، مگر اس میں صفات مذکر مونث کی تصریح اور کچھ حک و اضافے کے ساتھ آئی ہیں: مسلمین اور مسلمات، مومنین اور مومنات، قانتین اور قانتات، صادقین اور صادقات، صابرین اور صابرات، خاشعین اور خاشعات، متصدقین اور متصدقات، صائمین اور صائمات، حافظین فروج اور حافظات، ذاکرین اور ذاکرات۔ آل عمران کی آیت اور اس آیت میں ترتیب بھی مختلف ہے اور صفات کی تعداد میں بھی فرق ہے۔ مزید یہ کہ ان آیات سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان ترتیبوں میں کوئی درجے کا پہلو بھی ملحوظ ہے،

بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام صفات بہ یک وقت مطلوب ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین میں ایمان وعمل اور اخلاق وطاعات بہ یک وقت مطلوب ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی فرد کو انھیں پانے میں کچھ مراحل سے گزرنا پڑے یا افراد میں رنگ شخصیت کے پہلو سے اظہار میں کچھ فرق نظر آئے، لیکن ان کے مطلوب ومحمود ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر ان روایات کا کیا مطلب ہے؟ مثلاً سب سے پہلی روایت میں پہلے ایمان کا ذکر ہے، پھر جہاد کا ذکر ہے اور تیسری بار حج مبرور کا بیان ہے۔ ایمان تمام دین کی بنیاد ہے، اس لیے اس کی اولیت اسی پہلو سے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد جہاد کا ذکر ہے۔ یہ دین کے ساتھ تعلق کا تقاضا ہے۔ سورۂ توبہ میں اس سے گریز کا جو نتیجہ بیان ہوا ہے، اس سے واضح ہے کہ دین کو جب جان ومال کی ضرورت پیش آجائے، اس سے گریز ایک مسلمان کو بھی فاسقین کی صف میں کھڑا کر دیتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ تیسری چیز حج مبرور ہے۔ یہ وہ عبادت ہے جس کے لیے کچھ عرصے کے لیے گھر بار بھی چھوڑنا پڑتا ہے اور مال اور سعی و جہد کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر حج کی جہاد سے بھی ایک مناسبت ہے، اس لیے کہ اس کے مناسک خدا کے ساتھ وابستگی اور بندگی کے سب سے بڑے دشمن شیطان کے خلاف سعی کی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حج اور جہاد، دونوں میں سے کون سی چیز نمایاں حیثیت اختیار کرسکتی ہے؟ اس کا تعلق حالات سے ہے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ یہاں ترجیح حالات کے تحت ہے، مطلق نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقع پر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسی سوال کے جواب میں سب سے پہلے نماز کو بیان کیا۔ نماز کے بعد والدین کے ساتھ نیکی اور آخر میں جہاد کا ذکر ہے۔ نماز ایمان کا سب سے بڑا مظہر ہے، لیکن یہاں وقت پر نماز پڑھنے کی قید سے اس پر عمل میں مستعدی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کو سورۂ بنی اسرائیل میں توحید کے بعد رکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا حق جو انسان پر عائد ہوتا ہے، وہ توحید کا ہے اور اس کے بعد والدین کا حق ہے۔ اس کے بعد جہاد ہے جو دین کے ساتھ وابستگی کا حق ہے۔

اس تجزیے سے واضح ہے کہ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان وعمل کی فطری ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے اور وہاں ایمان محض قول وقرار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ پوری طرح دین میں داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ اعمال میں آپ نے اس زمانے کے حالات میں جو تقاضا سامنے تھا، اس کو بیان کیا اور سورۂ توبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہجرت کے بعد دین کے ساتھ وابستگی کے سب سے بڑے تقاضے کی حیثیت سے سامنے آیا ہوا تھا۔ حج عمومی حالات میں سب سے بڑی عبادت اپنی مخصوص نوعیت کی وجہ سے بن جاتا ہے۔ دوسری روایت میں نماز، والدین

کے ساتھ نیکی اور جہاد کا ذکر ہے۔ یہاں حقوق کا پہلو ملحوظ ہے۔

قرآن مجید اور ان روایات کو سامنے رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے پیش نظر مطلوب و مقصود کو واضح کرنا ہے، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل کرنے والے کے حالات سامنے رکھ کر جواب دے رہے ہیں۔ قرآن مجید کے متعدد مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حالات، نیت اور سعی و جہد کے فرق سے اعمال کے اجر میں فرق پیدا ہو جاتا ہے، ان روایات میں یہ پہلو بھی ملحوظ ہے۔

امام مسلم ان روایات میں ایک ایسی روایت بھی لائے ہیں جس میں اس سوال کے علاوہ دو اور سوال بھی کیے گئے ہیں۔ اس روایت کے مطابق حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور سے یہ بھی پوچھا تھا کہ سب سے بہتر گردن چھڑانا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جو سب سے قیمتی اور قابل قدر ہو۔ یہ جب اس اصول پر مبنی ہے کہ دین پر عمل کرنے میں سب سے بہتر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس پر حضرت ابوذر نے پوچھا کہ اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو؟ آپ نے کہا: کسی کام کرنے والے کی مدد کرو یا کرنے کی اہلیت نہ رکھنے والے کا کام بنا دو۔ یہ معاشرے میں ایک خیر خواہ انسان کی حیثیت سے جینے کی تلقین ہے۔ اس پر حضرت ابوذر نے پوچھا: اگر میں عمل کرنے میں اس درجے پر نہ پہنچ پاؤں تو؟ آپ نے فرمایا: اپنے شر سے دوسروں کو بچاؤ، یہ خود ایک صدقہ ہے۔ پہلی بات آگے بڑھ کر مدد کرنے کی تھی تو دوسری بات منفی رویوں سے دوسروں کو بچانے کی ہے۔

ان روایات میں زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کا پہلو ملحوظ ہے۔ یہی ان روایات کا مرکزی نکتہ ہے۔

متون

امام مسلم نے جو روایات منتخب کی ہیں، ان میں چند اعمال کا ذکر ہے، جو ''کون سا عمل بہترین ہے'' کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے تھے۔ دوسری کتب روایت میں ان کے علاوہ اعمال بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً کسی روایت میں ترک دنیا اور زبان سے ذکر کو، کسی میں صبر کو، کسی میں حسن خلق کو، کسی میں عمل پر مداومت کو، کسی میں طول قیام کو اور کسی میں حج کی قربانی اور بہ آواز بلند تلبیہ پڑھنے کو بہترین عمل قرار دیا گیا ہے۔

وہ روایات جن کے متن امام مسلم کے متون سے ملتے جلتے ہیں، ان میں کچھ فرق بھی ہیں۔ مثلاً بعض روایات میں پانچ نمازوں کی تصریح ہے۔ نمازوں ہی کے حوالے سے کسی میں وقت پر اور کسی میں اول وقت پر پڑھنے کو بہترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ کسی میں ایمان کے شک سے پاک ہونے کی وضاحت ہے۔ کسی میں حج مبرور کے ساتھ

عمرے کا بھی ذکر ہے۔ جہاد کے بجائے کچھ متون میں غزوے کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ کسی میں حج مبرور کی فضیلت اس تمثیل سے بیان کی گئی ہے کہ جیسے مغرب اور مشرق کا فاصلہ۔ کسی میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسالت کا بھی ذکر ہے۔

عام طور پر روایات میں سوال والے جملے میں 'افضل' کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے، لیکن بعض متون میں اس کی جگہ 'خیر' کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض میں 'أحب إلی اللّٰه' کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح کچھ روایات میں جہاد کا ذکر نہیں ہے۔ کچھ روایات میں ایمان کا ذکر نہیں ہے اور کچھ میں حج کا ذکر نہیں ہے۔ بعض متون میں صرف ان میں سے کسی ایک عمل ہی کا بیان ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۸۳- ۸۵؛ بخاری، رقم ۲۶، ۱۴۴۷، ۲۳۸۲، ۷۰۹۶؛ ابوداؤد، رقم ۴۲۶، ۱۳۲۵، ۱۴۴۹؛ ترمذی، رقم ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۶۵۸، ۱۸۹۸؛ نسائی، رقم ۲۵۲۶، ۲۶۲۴، ۳۱۳۰، ۴۹۸۵، ۴۹۸۶؛ مصنف عبدالرزاق، رقم ۲۰۲۹۵، ۲۰۲۹۶، ۲۰۳۰۴؛ مسند ابن الجعد، رقم ۳۴۳۱؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۷۶۳۲، ۳۰۳۹۳؛ احمد، رقم ۸۳، ۳۷۹، ۷۵۰۲، ۷۵۸۰، ۷۶۲۹، ۷۸۵۰، ۸۵۶۳، ۹۰۲۶، ۹۶۹۸، ۱۰۷۶۷، ۱۰۸۹۱، ۱۵۴۳۷، ۱۷۸۴۷، ۱۹۰۳۲، ۱۹۰۳۳، ۲۱۳۶۹، ۲۱۴۸۷، ۲۳۸۳۴، ۲۷۱۳۹، ۲۷۱۴۱؛ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۵۱۵؛ دارمی، رقم ۱۴۲۴، ۲۳۹۳، ۲۷۳۸، ۲۷۳۹؛ السنن الکبریٰ، رقم ۲۳۰۵، ۳۶۰۳، ۴۳۳۸، ۱۱۷۱۶، ۱۱۷۱۷؛ ابن خزیمہ، رقم ۲۶۳۱؛ ابن حبان، رقم ۱۵۲، ۱۵۳، ۸۱۸، ۱۴۷۵، ۱۴۷۹، ۴۵۹۵، ۴۵۹۷، ۴۵۹۸؛ المعجم الکبیر، رقم ۸۱۰؛ دارقطنی، رقم ۴؛ المستدرک، رقم ۶۷۶، ۲۳۸۶؛ بیہقی، رقم ۴۴۶۶، ۷۵۶۲، ۱۰۱۶۹، ۱۱۲۲۱، ۱۲۳۷۵، ۱۸۲۶۴، ۱۸۳۰۷، ۱۸۸۶۱، ۲۱۱۰۳۔

محمد عمار خان ناصر

عہد نبوی میں جہاد وقتال کی نوعیت

[یہ مصنف کی کتاب ''جہاد: ایک مطالعہ'' کا ایک باب ہے۔ قارئین اشراق
کے لیے اس کتاب کے مباحث بالترتیب شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)]

قرآن وسنت کے نصوص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو اہل ایمان کو عہد نبوی کے معروضی حالات کے تناظر میں جہاد وقتال کا حکم دو طرح کے مقاصد کے تحت دیا گیا: ایک اہل کفر کے فتنہ وفساد اور اہل ایمان پر ان کے ظلم وعدوان کا مقابلہ کرنے کے لیے اور دوسرے کفر وشرک کا خاتمہ اور باطل ادیان کے مقابلے میں اسلام کا غلبہ اور سربلندی قائم کرنے کے لیے۔

پہلے مقصد کے تحت قتال کی تفصیل حسب ذیل نصوص میں بیان کی گئی ہے:

أُذِنَ لِلَّـذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ـ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْراً وَّلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰)

''جن اہل ایمان کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے، انھیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ بھی لڑائی کریں) کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، محض اس جرم میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب صرف اللہ ہے۔ اور اگر اللہ ایک گروہ (کے ظلم وعدوان کو) دوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع نہ کرے تو خانقاہوں، گرجوں، کنیسوں اور مسجدوں جیسے مقامات، جن میں اللہ کو کثرت سے یاد کیا جاتا ہے، گرا دیے جاتے۔''

اور جو لوگ اللہ کی مدد کریں گے، اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ بہت قوت والا نہایت غالب ہے‘‘۔

سورۃ النساء میں فرمایا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا (النساء ۴:۷۵)

’’تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور کفار کی چیرہ دستی کا شکار ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو چھڑانے کے لیے قتال نہیں کرتے جو یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ، ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارے لیے کوئی مددگار اور اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی حامی بھیج دے۔‘‘

سورۂ انفال میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (الانفال ۸:۷۲،۷۳)

’’اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ کسی ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم (ان کے مقابلے میں) اہل ایمان کی مدد نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد پھیل جائے گا۔‘‘

ان نصوص کا حاصل یہ ہے کہ کفار کے جو گروہ مسلمانوں پر کسی بھی نوعیت کے ظلم وستم اور جارحیت کا ارتکاب کریں اور بالخصوص عقیدہ ومذہب کے انتخاب واختیار کے معاملے میں ان کی آزادی ان سے چھیننے کی کوشش کریں، ان کے خلاف تلوار اٹھانا نہ صرف جائز ہے بلکہ قوت واستطاعت اور حالات کی موافقت اور جنگ کے اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی شرط کے ساتھ ایک اخلاقی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاد کا دوسرا مقصد یعنی کفر وشرک کا خاتمہ اور اسلام کی سر بلندی کا قیام درج ذیل نصوص میں بیان ہوا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (البقرہ:۱۹۳)

''اوران کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

مذکورہ آیت ہجرتِ مدینہ کے بعد جہاد کے حوالے سے دی جانے والی ہدایات کے بالکل ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں کفار کے فتنہ وفساد کو خدا کے دین کی سر بلندی کی راہ میں ایک رکاوٹ قرار دیتے ہوئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ قتال کیا جائے تا کہ فتنہ ختم ہو سکے اور خدا کا دین سر بلند ہو جائے۔

عہد نبوی میں جہاد وقتال کے آخری مراحل میں دین حق کو قبول نہ کرنے والے گروہوں کے حوالے سے متعین احکام سورۂ توبہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ مشرکین عرب کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْ الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُواْ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلاَةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (التوبہ:۵)

''پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور ان کو پکڑو اور گھیرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر یہ شرک سے تائب ہو جائیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اہل کتاب کے حوالے سے فرمایا گیا کہ:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَّدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبہ:۲۹)

''ان اہل کتاب کے ساتھ جنگ کرو جو نہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دین حق کی پیروی قبول کرتے ہیں۔ (ان کے ساتھ جنگ کرو) یہاں تک کہ یہ تمھارے مطیع بن کر ذلت اور پستی کی حالت میں جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ سلم کا ارشاد ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں جب تک کہ وہ 'لا الٰہ الا اللہ' اور 'محمد رسول اللہ'

ویقیموا الصلاۃ ویوتوا الزکاۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔ (بخاری، رقم ۲۴)

کا اقرار نہ کر لیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی پابندی قبول نہ کر لیں۔ پھر جب وہ ایسا کر لیں تو اسلام کے عائد کردہ کسی حق کے علاوہ وہ اپنی جانوں اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہوگا۔‘‘

ان نصوص کا مدعا یہ ہے کہ کفر وشرک کا ارتکاب کرنے والے گروہوں کے خلاف قتال کا فریضہ انجام دیا جائے تاکہ وہ یا تو دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں اور یا ان کی سیاسی خود مختاری کا خاتمہ کر کے اہل اسلام کو اہل کفر پر بالادست اور دین حق کو باطل ادیان پر غالب کر دیا جائے۔

یہ نصوص اپنے ظاہر کے لحاظ سے اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد وقتال کا جو حکم دیا گیا، وہ اپنے ہدف کے لحاظ سے مخالف گروہوں کے فتنہ وفساد کو فرو کرنے اور اہل ایمان کو ان کے ظلم وتعدی سے بچانے تک محدود نہیں تھا، بلکہ خالص اعتقادی تناظر میں، کفر وشرک کا خاتمہ یا اہل کفر کو مسلمانوں کا محکوم بنانا بھی اس کے اہداف ومقاصد میں شامل تھا۔ کلاسیکی علمی روایت میں مذکورہ دونوں طرح کے نصوص کو جہاد کے دو الگ الگ اور مستقل بالذات مقاصد ہی کا بیان قرار دیا گیا ہے، تاہم دور جدید میں بہت سے اہل علم نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جہاد اسلام کی توسیع واشاعت کے لیے نہیں بلکہ محض اس کے دفاع اور دشمنان اسلام کے ظلم وجبر کے خاتمہ کے لیے مشروع کیا گیا تھا اور قرآن مجید میں جہاد کے تمام احکام اسی مخصوص تناظر میں عہد رسالت اور عہد صحابہ کے اسلام دشمن گروہوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی رو سے جن نصوص میں کفار ومشرکین کو قتل کرنے یا محکوم بنا کر ان پر جزیہ عائد کرنے کا ذکر ہوا ہے، ان کو انھی کفار سے متعلق سمجھنا چاہیے جو اسلام اور مسلمانوں پر ظلم وتعدی کی ابتدا کے مرتکب ہوئے تھے اور ان کے بارے میں مستقل طور پر معاندانہ روش اختیار کیے ہوئے تھے۔ گویا اگر یہ اہل کفر مسلمانوں کے لیے اپنے مذہب پر قائم رہنے کا حق کھلے دل سے تسلیم کر لیتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے کفر وشرک سے کوئی سروکار نہ ہوتا اور آپ عقیدہ ومذہب کی بنیاد پر ان سے کسی قسم کا کوئی تعرض کیے بغیر ان کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کا راستہ اختیار کر لیتے۔ (اس نقطہ نظر کے حق میں جو استدلالات پیش کیے گئے ہیں، آگے چل کر ہم ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔)

ہماری رائے میں اس نقطہ نظر کو قبول کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ قرآن مجید کے نصوص میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت کے پس منظر،اس کے مقصد اور اس مقصد کے حصول کی حکمت عملی کے حوالے سے جو پوری اسکیم بیان ہوئی ہے، اس کو کلیتاً نظر انداز کر دیا جائے۔قرآن مجید کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ،سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کی دعا کے مطابق ، بنی اسماعیل کے تزکیہ وتطہیر اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کے لیے ہوئی تھی۔سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی ذریت کو حجاز کے علاقے میں آباد کیا تھا اور ان سے توحید پر قائم رہنے اور شرک سے اجتناب کا عہد لے کر بیت الحرام کی تولیت اور دربانی کے فرائض ان کے سپرد فرمائے تھے۔سورۂ بقرہ میں ہے:

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لاَ يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۔ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ..... وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلاَّ مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۔إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ وَوَصَّى بِهَا . إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلاَ تَمُوتُنَّ إَلاَّ وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ۔(بقرہ ۱۲۴-۱۳۲)

’’اور جب ابراہیم کے رب نے چند باتوں میں اس کو آزمایا تو اس نے ان کو پورا کر دکھایا۔اللہ نے کہا کہ میں تمھیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ابراہیم نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (پیشوا بنانا)۔اللہ نے کہا کہ میرے اس وعدے میں ظالم شامل نہیں ہوں گے۔اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا اور (حکم دیا کہ) ابراہیم کی جائے سکونت کو نماز کی جگہ بنالو۔اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی کہ میرے گھر کو طواف اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے (شرک سے) پاک رکھنا۔ ...... اور ابراہیم کے دین سے کون روگردانی کر سکتا ہے سوائے اس کے جو نادان ہو۔ہم نے اس کو دنیا میں بھی منتخب کیا اور آخرت میں بھی وہ نیک لوگوں کے زمرے میں ہوگا۔ جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا کہ فرماں برداری اختیار کر لو تو اس نے کہا کہ میں رب العالمین کے سامنے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔اور ابراہیم نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین

پسند فرمایا ہے، اس لیے مرتے دم تک اسی کے فرماں بردار رہنا۔‘‘

سورۂ ابراہیم میں ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـذَا الْبَلَدَ آمِناً وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الأَصْنَامَ ۔ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ رَّبَّنَا إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلاَةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم ۱۴: ۳۵-۳۷)

’’اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے بچائے رکھ کہ ہم بتوں کی پرستش کرنے لگیں۔ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سو جس شخص نے میری پیروی کی، وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں بسایا ہے جہاں کوئی کھیتی نہیں تاکہ اے پروردگار، یہ نماز قائم کریں۔ سو تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں سے روزی دے تاکہ یہ شکر ادا کریں۔‘‘

بنی اسماعیل اپنی تاریخ کے بیشتر حصے میں اصل ملت پر قائم رہے، تاہم رفتہ رفتہ ان میں انحراف پیدا ہوتا گیا اور شرک و بدعت ان کے مابعد الطبیعیاتی تصورات، مناسک عبادت اور معاشرتی رسم و رواج میں سرایت کرتے چلے گئے اور توحید خالص کا مرکز یعنی بیت الحرام ’شرک‘ کا گڑھ بن کر رہ گیا۔ سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کی دعا کے مطابق چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں مبعوث کیا تو ملت ابراہیمی کی اصل تعلیمات کے احیا اور مشرکانہ بدعات کے خاتمے کو آپ کی جدوجہد کا ہدف قرار دیا۔ قرآن نے واضح کیا کہ آپ عام معنوں میں کوئی داعی، واعظ اور مبلغ نہیں، بلکہ خدا کے رسول اور اس کے آخری پیغمبر ہیں، چنانچہ خدا کے قانون کے مطابق آپ کی جدوجہد کا کامیابی سے ہم کنار ہونا اور جزیرۂ عرب میں خدا کے دین کا غلبہ قائم ہونا ایک طے شدہ فیصلہ ہے جو اہل کفر کی خواہشات، کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم قائم ہو کر رہے گا:

هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (التوبہ ۳۳)

''اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی ناپسند ہو۔''

دین کا یہ غلبہ، ظاہر ہے کہ منکرین حق کے خلاف قائم کیا جانا تھا اور اس کی عملی صورت یہ تھی کہ بیت اللہ کو مشرکین کے قبضہ وتصرف سے آزاد کرا کے دوبارہ توحید خالص کا مرکز بنا دیا جائے اور اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین سرزمین عرب میں غالب اور سر بلند نہ رہے۔ اس ہدف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے 'قتال' کا ناگزیر ہونا تاریخ وسیرت سے واقف ہر شخص پر واضح ہے اور قرآن مجید میں کفار کے خلاف جہاد وقتال کے احکام، جیسا کہ ہم ابھی واضح کریں گے، اسی تناظر میں وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے:

بیت اللہ پر اس وقت مشرکین قریش قابض ومتصرف تھے اور نہ صرف یہ کہ دعوت توحید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، بلکہ انھوں نے توحید پر ایمان رکھنے کی پاداش میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والے لوگوں پر ظلم وستم اور ایذا رسانی کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں بیت اللہ کو شرک سے پاک کر کے دوبارہ توحید کا مرکز بنا دینا اس کے بغیر ممکن نہیں تھا کہ مشرکین کے خلاف تلوار اٹھائی جائے اور ان کے غلبہ وتسلط کو طاقت کے زور پر ختم کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر سرداران قریش کو اس حقیقت پر ان الفاظ میں متنبہ کیا کہ:

اتسمعون یا معشر قریش اما والذی نفسی بیده لقد جئتکم بالذبح (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۲۷۴)

''اے گروہ قریش! کیا تم سن رہے ہو؟ یاد رکھو، خدا کی قسم! میں تمھارے لیے ذبح کا انجام لے کر آیا ہوں۔''

ایک دوسرے موقع پر ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام کو یوں بیان کیا کہ:

ان محمدا یزعم انکم ان تابعتموه علی امره کنتم ملوك العرب والعجم ....وان لم تفعلوه کان له فیکم ذبح (السیرۃ النبویۃ، ۱/۴۳۶)

''محمد کا دعویٰ ہے کہ اگر تم نے اس کے دین کی پیروی کی تو تم عرب وعجم کے حکمران بن جاؤ گے، لیکن اگر ایسا نہ کیا تو اس کے ہاتھوں تمھاری خوں ریزی ہوگی۔''

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کو مکہ مکرمہ میں اس کی اجازت نہیں دی گئی جس کی وجہ یہ ہے کہ

کسی آزاد اور خود مختار علاقے میں ایک باقاعدہ نظم اجتماعی کے تحت اپنی سیاسی و حربی طاقت کو مجتمع کیے بغیر یہ مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ حق کا غلبہ باطل پر بزور قوت قائم کر دینے کے لیے انھیں جس حکومت و اقتدار کی ضرورت ہے، اس کے حصول کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے رہیں:

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَاناً نَّصِيراً ـ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً (بنی اسرائیل ۸۰، ۸۱)

”اور دعا کرو کہ اے پروردگار! مجھے عزت و اکرام کے ساتھ داخل کر اور (مکہ سے) خیر و خوبی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے پاس سے ایسا اقتدار نصیب فرما جو مددگار ہو۔ اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا، کیونکہ باطل کے لیے نابود ہونا ہی مقدر ہے۔“

اللہ کے حکم سے آپ کا مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنا اسی مقصد کے لیے تھا۔ چنانچہ انصار مدینہ کے اسلام قبول کرنے پر جب آپ نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے شہر میں مسلمانوں کے لیے ایک جاے پناہ اور مرکز فراہم کریں تو انھوں نے سوال کیا کہ:

يا رسول الله ان بيننا وبين الرجال حبالا وانا قاطعوها يعني اليهود فهل عسيت ان نحن فعلنا ذلك ثم اظهرك الله ان ترجع الى قومك وتدعنا؟ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۴۰۲)

”یا رسول اللہ! ہمارے اور یہود کے مابین تعلقات ہیں جنھیں (آپ کا ساتھ دینے کے لیے) ہم توڑ دیں گے، لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم یہ کر لیں اور پھر اللہ آپ کو (قریش پر) غلبہ عطا کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر واپس اپنی قوم کے پاس چلے جائیں؟“

مدینہ میں مسلمانوں کو ایک محفوظ جائے پناہ میسر آ گئی اور وہ ہجرت کر کے وہاں مجتمع ہونا شروع ہو گئے تو سورۂ حج کی آیت ۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں مشرکین مکہ کے خلاف قتال کی باقاعدہ اجازت دے دی:

إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ـ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ـ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَو

”بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے۔ اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہو بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے۔ جو مظلوم اپنے

لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَھُم بِبَعۡضٍ لَّھُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡھَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡراً وَلَیَنصُرَنَّ اللّٰہُ مَن یَنصُرُہُ إِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ۔الَّذِیۡنَ إِن مَّکَّنَّاھُمۡ فِیۡ الۡأَرۡضِ أَقَامُوا الصَّلَاۃَ وَآتَوُا الزَّکَاۃَ وَأَمَرُوا بِالۡمَعۡرُوفِ وَنَھَوۡا عَنِ الۡمُنکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡأُمُورِ۔ (الحج ۳۸۔۴۱)

گھروں سے بےقصور، محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں، جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، ڈھائے جا چکے ہوتے۔اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔‘‘

سورۂ حج میں یہ اجازت جس سلسلہ بیان میں آئی ہے، اس کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنَاہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَنِ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ (الحج:۲۶)

’’جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لیے مساوی کر دیا ہے، وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں، جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں الحاد کا ارادہ کرے، ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔‘‘

اس کے بعد مشرکین کے الحاد اور کفر کو واضح کرنے کے لیے آیت ۲۶ سے ۳۸ تک بیت اللہ کی ابتدائی تاریخ اور اس کی تعمیر کے اصل مقصد کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کے لیے جگہ خود متعین فرما کر حضرت ابراہیم کو اس کی تعمیر کا حکم دیا اور انھیں اس کا متولی بنا کر ہدایت کی کہ وہ اس کو خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں کے لیے کفر وشرک کی آلودگیوں سے پاک رکھیں۔اسی ضمن میں قربانی کی رسم کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت ابراہیمی میں قربانی صرف اللہ کے نام پر مشروع کی گئی تھی اور اس کے پیروکاروں سے کہا گیا تھا کہ وہ خدائے واحد ہی کے حضور قربانی گزرانیں اور اصنام واوثان کی نجاست سے دور رہیں۔اس کے بعد آیت ۳۹ میں

فرمایا گیا ہے کہ چونکہ مشرکین نے ملت ابراہیمی کے اصل پیروکاروں یعنی اہل ایمان کو محض اس وجہ سے مکہ مکرمہ سے نکال دیا ہے کہ وہ توحید کے قائل ہیں، اس لیے انھیں اجازت ہے کہ اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے مشرکین سے جہاد کریں۔قرآن نے یہاں 'ولینصرن اللہ من ینصرہ' کے الفاظ سے واضح کیا ہے کہ اس قتال کا مقصد محض مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا نہیں، بلکہ خدا کے دین کی نصرت کرنا بھی تھا جس کی عملی صورت یہ تھی کہ بیت اللہ کو مشرکین کے تسلط سے آزاد کرا کے اسے ملت ابراہیمی کی روایات کے مطابق خالص توحید کا مرکز بنانے کے لیے قتال کیا جائے۔ابن عباس بیان کرتے ہیں:

لما اخرج النبی صلی اللہ علیه و سلم من مکة قال ابو بکر اخرجوا نبیهم لیهلکن فانزل اللہ تعالیٰ اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا و ان اللہ علی نصرهم لقدیر فقال ابو بکر لقد علمت انه سیکون قتال (ترمذی، رقم ۳۰۹۵)

''جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تو ابوبکر نے کہا کہ اہل مکہ نے اپنے نبی کو نکال دیا ہے، اب یہ ضرور ہلاک ہو کر رہیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا و ان اللہ علی نصرهم لقدیر تو ابوبکر نے کہا کہ میں نے جان لیا ہے کہ (قریش کو سزا دینے کے لیے) عنقریب قتال ہوگا۔''

دوسرے مقام پر قرآن نے واضح کیا ہے کہ قریش سے عرب کا اقتدار چھین کر اہل ایمان کے سپرد کیے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جزیرۂ عرب میں شرک کے بجائے توحید غالب ہو اور خدا کا پسندیدہ دین یہاں متمکن ہو جائے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ (النور ۵۵)

''اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر حال میں انھیں اس سرزمین میں اسی طرح اقتدار عطا کرے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا اور ان کے لیے ان کے دین کو لازماً مستحکم کر دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو یقیناً امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائیں گے جو اس کے بعد بھی انکار کریں تو وہی بدکار ہیں۔''

قتال کی اجازت ملنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ سے عقبہ اخیرہ کی بیعت لی تو اس کا یہ مفہوم انصار اور اہل مکہ، دونوں پر بالکل واضح تھا کہ یہ درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کے خلاف برسر جنگ ہونے کی تمہید ہے۔ بیعت کے موقع پر عباس بن عبادہ نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا:

یا معشر الخزرج هل تدرون علام تبایعون هذا الرجل؟ قالوا نعم قال انکم تبایعونه علی حرب الاحمر والاسود من الناس (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۱/۴۰۵)

''اے گروہ خزرج! کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی کے ہاتھ پر کس چیز کی بیعت کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ عباس نے کہا کہ تم اس کے ساتھ (عرب کے) سارے لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کی بیعت کر رہے ہو۔''

بیعت کے بعد انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اسی وقت کفار کے خلاف تلوار اٹھانے کے لیے تیار ہیں:

واللہ الذی بعثك بالحق ان شئت لنمیلن علی اهل منی غدا باسیافنا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لم نؤمر بذلك (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۱/۴۰۷)

''اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، ہم کل ہی اپنی تلواروں کے ساتھ اہل منیٰ پر پل پڑیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا۔''

ابن اسحاق بیعت عقبہ ثانیہ کی سیاسی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کانت بیعة الحرب حین اذن اللہ لرسوله صلی اللہ علیه وسلم فی القتال شروطا سوی شرطه علیهم فی العقبة الاولی کانت الاولی علی بیعة النساء وذلك ان اللہ تعالیٰ لم یکن اذن لرسوله صلی اللہ علیه وسلم فی الحرب فلما اذن اللہ له فیها وبایعهم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی العقبة الاخیرة علی حرب

''جب اللہ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتال کی اجازت دے دی تو آپ نے (انصار سے) جنگ کی جو بیعت لی، اس میں ایسی شرائط بھی شامل کیں جو عقبہ اولیٰ کی بیعت میں نہیں تھیں۔ پہلی بیعت تو انھی باتوں پر لی گئی تھی جن کا ذکر عورتوں سے لی جانے والی بیعت میں ہوا ہے کیونکہ اس وقت اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ پھر جب اللہ نے اس کی اجازت دے دی اور آپ نے عقبہ اخیرہ میں

الاحمر والاسود اخذ لنفسه واشترط علی القوم لربه وجعل لهم علی الوفاء بذلك الجنة (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۱/ ۴۱۲)

ان سے احمر واسود کے خلاف جنگ پر بیعت لی تو آپ نے اپنے لیے (پناہ اور حفاظت) کا عہد بھی لیا اور لوگوں پر اللہ کے عہد پر قائم رہنے کی شرط بھی عائد کی اور اس عہد کو پورا کرنے پر ان سے جنت کا وعدہ کیا۔''

مدینہ میں مسلمانوں کے اجتماع اور پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا یہ مفہوم ومقصد قریش پر بھی بالکل واضح تھا، چنانچہ بیعت عقبہ کا واقعہ ان کے علم میں آیا تو ان کے اعیان اگلے ہی دن بنوخزرج کے پاس گئے اور ان سے کہا:

یا معشر الخزرج انه قد بلغنا انكم قد جئتم الی صاحبنا هذا تستخرجونه من بین اظهرنا وتبایعونه علی حربنا (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۱/ ۴۰۷)

''اے گروہ خزرج! ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم ہمارے اس آدمی کے پاس اس لیے آئے ہو کہ اسے ہمارے درمیان سے نکال کرلے جاؤ اور تم ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اس کے ساتھ بیعت کر رہے ہو۔''

ابن اسحاق لکھتے ہیں:

لما رات قریش ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد صارت له شیعة واصحاب من غیرهم بغیر بلدهم وراوا خروج اصحابه من المهاجرین الیهم عرفوا انهم قد نزلوا دارا واصابوا منهم منعة فحذروا خروج رسول الله صلی الله علیه وسلم الیهم وعرفوا انه قد اجمع لحربهم (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۱/ ۴۴۴)

''جب قریش نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی جماعت بن گئی ہے اور اہل مکہ کے علاوہ ایک دوسرے علاقے میں کچھ اور ساتھی بھی ان کو مل گئے ہیں اور پھر انھوں نے مسلمانوں کے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کو بھی دیکھا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ مسلمانوں کو قریش کے مقابل ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا ہے، چنانچہ انھیں فکر ہوئی کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نکل کر ان کے پاس چلے جائیں گے۔ قریش نے جان لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف جنگ کا مصمم عزم کر چکے ہیں۔''

یہی وہ ڈر تھا جس کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے موقع پر جب قریش آپ کے حوالے سے کوئی لائحہ عمل وضع کرنے کے لیے دارالندوہ میں جمع ہوئے تو آپ کو گرفتار کر کے محبوس کر دینے یا مکہ سے نکال دینے کی تجاویز پر اتفاق نہیں ہو سکا، کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ خطرہ تھا کہ آپ یا آپ کے ساتھی بالآخر مکہ مکرمہ پر حملہ کر کے قریش کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ قریش نے نعوذ باللہ آپ کو قتل کرنے کی تجویز پر اتفاق کر لیا۔ (ابن

ہشام، السیرۃ النبویہ، ۱/۴۳۶)

بہرحال مشرکین کے ناپاک منصوبوں کے علی الرغم جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور آپ کی سربراہی میں ایک باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو سورۂ بقرہ میں مشرکین کے خلاف قتال کا باقاعدہ حکم دیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصل ہدف اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہے اور قریش کے خلاف قتال کر کے ان کے فتنہ وفساد کو ختم کرنے کا حکم اسی مقصد کے تحت دیا جا رہا ہے:

وَقَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِینَ۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَیْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّی یُقَاتِلُوكُمْ فِیهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِینَ۔ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰہَ غَفُورٌ رَّحِیمٌ۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّی لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَیَكُونَ الدِّینُ لِلّٰہِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَی الظَّالِمِینَ (البقرہ ۱۹۰-۱۹۳)

’’اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو، لیکن زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، وہاں سے تم بھی ان کو نکالو۔ اور فتنہ، قتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہاں، مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو، یہاں تک کہ وہ تم سے لڑائی نہ کریں۔ پھر اگر وہ لڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی ہے بدلہ کافروں کا۔ اور اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ معاف کر دینے والا، مہربان ہے۔ اور ان سے برابر لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ اور اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی پر زیادتی روا نہیں۔‘‘

یہاں قتال کی غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ ’فتنہ‘ باقی نہ رہے اور اس کا نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے گا۔ اس سے قرآن کی مراد یہ تھی کہ قریش کی قوت کو توڑ کر مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا جائے اور مشرکین کو بیت الحرام سے بے دخل کر کے یہاں سے شرک کے تمام آثار کو مٹا دیا جائے تاکہ عرب کے مشرکین شرک کو ذلیل اور توحید کو سربلند دیکھ کر من حیث الجماعت دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ سورۂ نصر میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ اور مشرکین عرب کے بحیثیت قوم اسلام قبول کر لینے کا ذکر ایسے بلیغ اسلوب میں کیا ہے کہ رسول اللہ کی بعثت کے یہ دونوں ہدف پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتے ہیں۔ فرمایا:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجاً ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً (النصر ۱-۳)

''جب اللہ کی مدد آ جائے اور (مکہ) فتح ہو جائے اور تم لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھ لو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

قرآن نے فتح مکہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے یہ واضح کر دیا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد قتال میں حصہ لینے والے کسی طرح اس سے پہلے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے:

لا يَسْتَوِيْ مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُوْلَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلّاً وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنَى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (الحدید ۱۰)

''تم میں سے وہ لوگ جنھوں نے (مکہ کی) فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور جہاد کیا (اور وہ جنھوں نے نہیں کیا) برابر نہیں ہو سکتے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہے جنھوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اور دونوں کے ساتھ اللہ نے اچھے بدلے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔''

اس ضمن میں وَمَا كَانُوآ اَوْلِيَآءَهُ اِنْ اَوْلِيَآؤُهُ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (الانفال: ۳۴۔ ''مشرکین مسجد حرام کے متولی نہیں۔ اس کی تولیت کے حق دار تو صرف اللہ سے ڈرنے والے ہیں'') اور 'مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَن يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ الله شَاهِدِيْنَ عَلَى أَنفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ '(التوبہ ۱۷۔ ''مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر خود کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مساجد کو آباد کریں) جیسی آیات میں یہ بات تو دوٹوک الفاظ میں واضح کر دی گئی تھی کہ مسجد حرام کو آباد کرنے اور اس کی تولیت وانتظام کے اصل حق دار اہل ایمان ہیں، جبکہ مشرکین اس کا کوئی حق نہیں رکھتے، تاہم مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کے لیے فوری اقدام کرنے کے بجائے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی کہ مختلف معرکوں میں قریش کی حربی قوت اور سیاسی پوزیشن کو زک پہنچا کر ان کا دم خم نکال دیا جائے تاکہ جب مسلمان مکہ کو فتح کرنے کے لیے جائیں تو شکستہ دل قریش ان کی مزاحمت نہ کر سکیں اور حدود حرم میں زیادہ خون ریزی کی نوبت نہ آنے پائے۔ اس ضمن میں پہلا اور فیصلہ کن معرکہ بدر میں بپا ہوا۔ ذخیرۂ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر کے محرکات میں، من جملہ دیگر عوامل کے، تحریش واغرا (Provocation) کی وہ کارروائیاں بھی شامل تھیں جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وقتاً فوقتاً قریش کے تجارتی قافلوں پر حملوں کی صورت میں کی گئیں۔ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

o رمضان ۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی قیادت میں ایک سریہ قریش کے تجارتی قافلے پر حملہ کرنے کے لیے ساحل سمندر کی طرف بھیجا، تاہم مجدی بن عمرو نے فریقین سے گفتگو کر کے لڑائی کو ٹال دیا۔(واقدی، المغازی ۹/۱)

o شوال ۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبیدہ بن الحارث کی قیادت میں ایک سریہ رابغ کی طرف بھیجا جہاں ان کی جھڑپ ابوسفیان بن حرب کی قیادت میں قریش کی ایک جماعت سے ہوئی۔(واقدی ۱۰/۱)

o ذوالقعدہ ۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تجارتی قافلے پر حملے کی غرض سے سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں ایک سریہ خرار کی طرف بھیجا،لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی قافلہ وہاں سے گزر چکا تھا، چنانچہ وہ مدینہ واپس آ گئے۔(واقدی، ۱/ ۱۱)

o صفر ۲ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلے پر حملے کی غرض سے خود ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ابوا کی طرف گئے،لیکن لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔(واقدی، ۱/ ۱۲)

o ربیع الاول میں آپ پھر اسی غرض سے بواط کی طرف گئے لیکن اس موقع پر بھی قافلے سے ٹکراؤ نہ ہو سکا۔ (ایضاً)

o اسی سال جمادی الاخریٰ میں آپ قریش کے قافلوں پر حملے کے لیے اپنے صحابہ کے ساتھ مقام ذی العشیرہ تشریف لے گئے۔(۱/ ۱۲، ۱۳)

o رجب ۲ ہجری میں آپ نے عبداللہ بن جحش کی قیادت میں ایک لشکر مقام نخلہ کی طرف بھیجا۔ان کو ہدایت یہ تھی کہ قریش کے قافلے کا جائزہ لے کر محض معلومات اکٹھی کریں، تاہم انھوں نے بلا اجازت قافلے پر حملہ کر دیا۔ (۱/ ۱۳، ۱۴)

o رمضان ۲ ہجری میں آپ نے شام سے لوٹنے والے قریش کے تجارتی قافلے پر حملے کی غرض سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ بدر کا معرکہ اسی سفر کے نتیجے میں پیش آیا، کیونکہ مکہ سے آنے والا قریشی لشکر اصلاً اپنے تجارتی قافلے ہی کو بچانے کے لیے نکلا تھا،لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص تدبیر سے قافلے کے بچ کر نکل جانے کے باوجود مسلمانوں کی مختصر جماعت میدان بدر میں مشرکین مکہ کے مقابلے میں معرکہ آرا ہوئی اور قریش کی صف اول کی

قیادت کا صفایا کر دیا۔

قریش کے تجارتی قافلوں سے وقتاً فوقتاً تعرض کا یہ سلسلہ غزوۂ بدر کے بعد بھی جاری رہا اور صلح حدیبیہ تک قریش کو مسلسل اس پالیسی سے زک اٹھانا پڑی۔ مثال کے طور پر قریش نے اپنے تجارتی قافلے کا راستہ بدل کر عراق کے راستے سے شام کا سفر کرنا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع ملنے پر زید بن حارثہ کی قیادت میں سو آدمیوں کا ایک جتھہ بھیجا جس نے قافلے کو لوٹ کر اس کا مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لا کر پیش کر دیا۔ (واقدی، ۱/۱۹۸)☆

☆ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے یہاں غیر ضروری طور پر یہ نکتہ چھیڑا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے سرایا کا مقصد قریش کے تجارتی قافلوں کے بارے میں محض معلومات حاصل کرنا یا چھیڑ چھاڑ کرنا تھا نہ کہ ان قافلوں کو لوٹ لینا۔ ان کے خیال میں ایسا کرنا ایک غیر اخلاقی اور اسلامی شریعت کی رو سے ''گناہ'' کا عمل ہوتا۔ (سیرت النبی ۱/۱۹۲) حالانکہ قریش عملاً مسلمانوں کے خلاف برسر جنگ تھے اور جنگی اخلاقیات کی رو سے ان کی جانیں اور ان کے اموال مسلمانوں کے لیے بدیہی طور پر مباح تھے۔ خود قرآن نے 'واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم' (الانفال ۷) کے الفاظ میں اس کی تصریح کی ہے کہ قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹ لینا مسلمانوں کے لیے مباح تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر مسلمانوں کے ایک سریے نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بن الربیع سے، جو اس وقت مشرک تھے اور شام کے ایک تجارتی سفر سے واپس آ رہے تھے، ان کا مال چھین لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کسی قسم کی نکیر نہیں فرمائی، بلکہ ابوالعاص کی تالیف قلب کے لیے مسلمانوں سے سفارش کی کہ 'فان تحسنوا وتردوا علیہ الذی لہ فانا نحب ذلک وان ابیتم فھو فیٔ اللہ الذی افاء علیکم فانتم احق بہ' (طبرانی، معجم کبیر ۲۲/۴۳۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/۵۸۰) یعنی ''اگر تم احسان کرتے ہوئے اس کا مال واپس کر دو تو یہ ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوگا، لیکن اگر نہ کرنا چاہو تو یہ اللہ کا مال ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے اور تم ہی اس کے حق دار ہو۔'' اسی طرح جب معاہدۂ حدیبیہ کے بعد ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں نے قریش کے قافلوں پر حملے کرنا شروع کیے اور لوٹا ہوا مال غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے معاہدے کی وجہ سے مال کو تو قبول نہیں کیا، لیکن ابوبصیر سے بھی یہ نہیں کہا کہ تمھارا ان قافلوں کو لوٹنا غیر اخلاقی ہے، اس لیے ایسا نہ کرو۔ خود شبلی نے ان دونوں واقعات کا ذکر کیا ہے، لیکن کوئی

اخلاقی سوال نہیں اٹھایا۔ (سیرت النبی ۱/۲۰۵، ۲۷۵)

جنگ بدر میں قریش کی عبرت ناک شکست درحقیقت فتح مکہ کی تمہید تھی، چنانچہ اس موقع پر کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے اشعار میں سرداران قریش کو یوں خبردار کیا:

فلا تعجل ابا سفیان وارقب	''ابوسفیان! جلدی میں مت پڑو اور اس وقت کا انتظار
جیاد الخیل تطلع من کداء	کرو جب (محمد اور اصحاب محمد کے) عمدہ اور بہترین
بنصر الله روح القدس فیها	گھوڑے مقام کداء سے نمودار ہوں گے۔ ان کو اللہ کی
و میکال فیا طیب الملاء	مدد اور جبریل اور میکائیل کی رفاقت حاصل ہوگی۔ سو یہ
(السیرۃ النبویۃ ۲/۲۵)	کیسی پاکیزہ جماعت ہوگی۔''

احد اور احزاب کی جنگیں بھی بدر ہی سے شروع ہونے والے سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ ان جنگوں کے ذریعے سے قریش کی طاقت اور ان کے عزم وہمت کو شکست دینے کا مقصد پورا ہو گیا اور ۵ ہجری میں غزوۂ خندق کے موقع پر مشرکین کا لشکر جرار ناکام ونامراد واپس پلٹ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا کہ اب مشرکین میں جنگ کا دم خم باقی نہیں رہا، اس لیے اب اقدام کرنے کی باری ان کی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

الآن نغزوهم و لا يغزوننا نحن نسير اليهم (بخاری، رقم ۳۸۰۱)

''اب ہم ان پر حملہ آور ہوں گے اور وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔ اب ان کی طرف بڑھنے کی باری ہماری ہے۔''

۶ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو مشرکین نے انھیں حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ سابقہ ہدایات کی رو سے اس موقع پر مسلمانوں کو حدود حرم میں تلوار اٹھانے کا پورا پورا حق حاصل تھا، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اہم تر مصالح کے پیش نظر مشرکین سے صلح کا معاہدہ کر لیا تو اس کو ذہنی طور پر قبول کرنا صحابہ کے لیے ایک آزمایش بن گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو قرآن مجید میں اس صلح کی حکمت اور اس کے پوشیدہ فوائد پر باقاعدہ ایک سورت نازل کرنا پڑی جس میں انھیں یہ بتایا گیا کہ اگرچہ مشرکین ان کو مسجد حرام سے روکنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن چونکہ مکہ میں ابھی بہت سے ایسے اہل ایمان موجود ہیں جو اپنے ایمان کو مخفی رکھے ہوئے ہیں اور ان کے اور مشرکین کے مابین واضح امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے خدشہ ہے کہ وہ بھی لڑائی میں تہ تیغ ہو جائیں گے، اس لیے اس موقع پر قتال کو موخر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں فتح مکہ کی بشارت اس وضاحت کے ساتھ دی گئی کہ مسجد حرام کا مسلمانوں کے تصرف میں آنا چونکہ 'اظہار دین'

یعنی جزیرۂ عرب میں غلبۂ اسلام کا لازمی تقاضا ہے، اس لیے یہ وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ هُوَ الَّذِىْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح: ۲۷۔۲۸)

’’یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا کہ اللہ نے چاہا تو تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے، سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے، تمھیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوگا۔ وہ ان باتوں کو جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے، پس اس نے اس کے بعد ایک قریبی فتح تمھارے لیے مقدر کر دی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔ اور اللہ کافی ہے گواہی دینے والا۔‘‘

قریش کے ساتھ اس معاہدے کے ذریعے سے آپ ایک طرف ان لوگوں کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے جو اسلام کو قبول کرنے کے خواہش مند تھے لیکن قبائلی تعلقات کی وجہ سے قریش اور مسلمانوں کی کشمکش میں کھل کر قریش کی مخالفت مول نہیں لے سکتے تھے اور دوسری طرف آپ مسلمانوں کی قوت اور توجہ کو یکسو کر کے قریش کے علاوہ دیگر مشرک قبائل کی سرکوبی کے لیے مرکوز کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے قریش کو معاہدۂ صلح کی پیش کش کرتے ہوئے یہ بات کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ان پر صاف واضح کر دی کہ یہ صلح مستقل بقاے باہمی کی غرض سے نہیں، بلکہ محض فریقین کی مصلحت کے لحاظ سے عارضی طور پر کی جا رہی ہے۔ آپ نے ان سے کہا:

انا لم نات لقتال احد، انما جئنا لنطوف بهذا البيت، فمن صدنا عنه قاتلناه، وقريش قوم قد اضرت بهم الحرب ونهكتهم، فان شاء وا ماددتهم مدة يامنون فيها ويخلون فى ما بيننا وبين الناس، والناس اكثر منهم، فان ظهر امرى

’’ہم کسی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم تو بیت اللہ کا طواف کرنے آئے ہیں۔ ہاں جو ہمیں اس سے روکے گا، اس کے ساتھ ہم جنگ کریں گے۔ جنگ پہلے ہی قریش کو بہت نقصان پہنچا چکی ہے اور اس نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، اس لیے اگر وہ چاہیں تو میں ایک مخصوص عرصے کے لیے ان کے ساتھ صلح کرنے کو تیار ہوں جس میں انھیں بھی ہماری طرف سے امن

علی الناس کانوا بین ان یدخلوا فی ما دخل فیه الناس او یقاتلوا وقد جمعوا، والله لاجهدن علی امری هذا حتی تنفرد سالفتی او ینفذ الله امره (الواقدی، المغازی، ۲/۵۹۳)

حاصل ہو اور وہ بھی ہمارے اور باقی اہل عرب کے معاملے میں دخل انداز نہ ہوں۔ اہل عرب کی تعداد قریش سے زیادہ ہے۔ سو اگر میں ان پر غالب آ گیا تو قریش کو اختیار رہوگا کہ چاہیں تو سب لوگوں کی طرح اس دین میں داخل ہو جائیں اور چاہیں تو جنگ کریں۔ اس وقت ان کی بکھری ہوئی قوت بھی مجتمع ہوگی۔ بخدا میں اس دین کے غلبے کے لیے جدوجہد کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ یا تو (سب لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں اور) میں اکیلا رہ جاؤں اور یا اللہ اپنے فیصلے کو نافذ کر دے۔''

سیدنا عثمانؓ رسول اللہ کے سفیر بن کر اہل مکہ کے پاس گئے تو انھوں نے بھی انھیں یہی پیغام دیا:

قال بعثنی رسول الله الیکم یدعوکم الی الله والی الاسلام تدخلون فی الدین کافة فان الله مظهر دینه ومعز نبیه واخری تکفون ویلی هذا منه غیرکم فان ظفروا بمحمد فذلك ما اردتم وان ظفر محمد کنتم بالخیار ان تدخلوا فی ما دخل فیه الناس او تقاتلوا وانتم وافرون جامون، ان الحرب قد نهکتکم واذهبت بالاماثل منکم (واقدی، المغازی، ۲/۶۰۰، ۶۰۱)

''عثمان نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اللہ اور اسلام کی دعوت دے کر تمھارے پاس بھیجا ہے۔ (بہتر یہی ہے کہ) تم سب کے سب اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہرحال اپنے دین کو غالب اور اپنے نبی کو سرفراز کرے گا۔ تمھیں اختیار ہوگا چاہو تو تمام لوگوں کی طرح تم بھی اس دین کو قبول کر لینا اور چاہو تو جنگ کر لینا۔ اس وقت تم تعداد کے لحاظ سے بھی کہیں زیادہ ہو چکے ہوگے۔ دیکھو، اس جنگ نے تمھاری کمر بالکل توڑ دی ہے اور تمھارے بہترین لوگ اس کا لقمہ بن چکے ہیں۔''

حدیبیہ کا یہ معاہدۂ صلح ۸ ہجری تک برقرار رہا اور قریش کی طرف سے اس کی کوئی خلاف ورزی اس دوران میں سامنے نہیں آئی۔ ۸ ہجری میں قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنوخزاعہ کے خلاف لڑائی میں بنوبکر کو مدد فراہم کی۔ سرداران قریش اس پر نادم ہوئے اور انھوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ صلح کی تجدید کر کے آئیں۔ ابوسفیان یہ پیشکش لے کر مدینہ گئے لیکن رسول اللہ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ بہتیرے جتن کرنے کے بعد آخر کار انھوں نے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ:

الا انی قد اجرت بین الناس و لا اظن محمدا یخفرنی

''لوگو سن لو! میں نے سب لوگوں کے سامنے (قریش اور ان کے حلیفوں کو) امان دی اور مجھے یقین ہے کہ محمد میری دی ہوئی اس امان کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔''

(باقی)

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

میقات حرم اور ان کی تعداد

سوال: میقات سے کیا مراد ہے؟ یہ تعداد میں کتنے ہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ پاکستانی حجاج کرام اپنے احرام کس جگہ سے باندھتے ہیں؟ (ذوالفقار شافی)

جواب: حج و عمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر بعض جگہیں متعین کر دی گئی ہیں جن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ ان پر یا ان کے برابر کسی بھی جگہ پر پہنچ کر ضروری ہے کہ احرام باندھ لیا جائے۔ اصطلاح میں انھیں میقات کہا جاتا ہے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصر و شام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

پاکستانی حجاج جب پاکستان سے سعودی عرب کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو وہ میقات کے اوپر سے گزرتے ہوئے حدود حرم میں داخل ہو جاتے ہیں، ضروری ہے کہ وہ جب حدود حرم میں داخل ہوں تو احرام باندھے ہوئے ہوں، لہٰذا انھیں ابتدائے سفر یعنی کراچی ایئر پورٹ ہی سے احرام باندھنا پڑتا ہے۔ آج کل حج کرانے والی کمپنیاں حاجیوں کی باقاعدہ رہنمائی کے لیے پورا پورا اہتمام کرتی ہیں، اس لیے آپ بے فکر رہیں، وہ اس مسئلے میں آپ کی

پوری پوری رہنمائی کریں گی اور آپ کو ویسا ہی کرنا چاہیے جیسا وہ گائیڈ کریں۔

استخارہ اور خیر کی طلب

سوال: استخارہ کرنے کی صورت میں جو جواب آئے، اس کی مخالفت کرنا درست ہے یا نہیں؟ (اعظم)

جواب: ایسا نہیں کہ دعاے استخارہ سے ہمارا خدا کے ساتھ رابطہ ہو جاتا ہے اور ہم اپنے مسئلے میں خدا کی بات یقینی صورت میں معلوم کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت صریحاً غلطی ہوتی۔

دعاے استخارہ دراصل، خدا سے خیر طلب کرنے کی دعا ہے۔ یہ دعا درج ذیل ہے:

''اے اللہ، میں تیرے علم کے واسطے سے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے واسطے سے قدرت طلب کرتا ہوں، اور تجھ سے تیرے فضل عظیم کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا، اور تو جانتا ہے، میں نہیں جانتا اور تو علام الغیوب ہے۔ اے اللہ، اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر دے اور آسان بنا دے، پھر اس میں برکت پیدا کر دے اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے دین اور میری زندگانی اور میرے انجام کار کے لحاظ سے برا ہے تو اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے۔ (پروردگار)، میرے لیے خیر کو مقدر فرما، وہ جہاں کہیں بھی ہو، پھر مجھے اس سے راضی کر دے۔''

اس میں ہم اللہ سے اس کے علم کے مطابق جو چیز بہتر ہو، وہ طلب کرتے ہیں۔ جب یہ دعا قبول ہوتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اشارے کے ذریعے سے خدا ہمیں اپنا کوئی فیصلہ سنا دیتا ہے، بلکہ دعا کی قبولیت کی صورت میں وہ اس چیز کو جو ہمارے لیے بہتر ہو، اسے ہمارے مقدر میں لکھ دیتا ہے، اس کے بارے میں ہمارا تردد ختم کر دیتا ہے، وہی ہماری پسند اور ہماری راے بن جاتی ہے، لہٰذا جو بات خواب وغیرہ میں ہم دیکھیں، اگر اس پر ہمارا دل نہیں جم رہا اور وہ ہمیں صحیح محسوس نہیں ہو رہی تو پھر اسے نہیں ماننا چاہیے۔ البتہ، اگر وہ ہمارے علم و عقل کے مطابق ہمیں بہتر محسوس ہو تب اس پر عمل کر لینا چاہیے، کیونکہ دعا کی قبولیت کی صورت میں خدا کے نزدیک جو بات بہتر ہے، اس نے مقدر ہو جانا ہے۔ خدا سے دعا مانگنے کے لیے دل کا اخلاص ضروری ہے۔ انسان کا پہلے سے بہت نیک ہونا لازم نہیں ہے۔

غیر مسلم ریاست میں ملازمت

سوال: کیا کسی مسلمان کے لیے دین میں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کسی غیر مسلم ریاست میں اپنی ملازمت یا اپنے کاروبار کے لیے مستقل اقامت اختیار کرے؟ (فیاض احمد)

جواب: ہمارے نزدیک دینی اعتبار سے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ اپنی ملازمت یا اپنے کاروبار کے لیے کسی غیر مسلم ریاست میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوں، سوائے اس کے کہ آپ کے لیے وہاں اپنے دین پر قائم رہنا ہی مشکل ہو جائے۔

غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''دین حق'' میں اسی مسئلے کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

''بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو اُس کا یہ ایمان اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن اِسے ''ہجرت'' کہتا ہے۔ زمانۂ رسالت میں جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے براہ راست اِس کی دعوت دی گئی تو اِس سے گریز کرنے والوں کو قرآن نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔

شادی سے پہلے جنسی تعلقات

سوال: کیا شادی سے پہلے آدمی کا اپنی ہونے والی بیوی سے جنسی تعلق قائم کرنا ناقابل معافی جرم یعنی گناہ کبیرہ ہے۔ (جوناتھن سٹو)

جواب: شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی سے بھی جنسی تعلق قائم کرنا زنا ہی ہے اور بے شک یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ:

''اور جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو سوائے حق کے ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اُس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو

اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔'' (الفرقان ۲۵: ۶۸-۷۰)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ بے شک زنا گناہ کبیرہ ہے اور اس کی سزا جہنم کا ابدی عذاب ہو سکتی ہے، لیکن اگر اللہ چاہے تو یہ سچی توبہ اور اصلاح سے بالکل معاف بھی ہو سکتا ہے۔

گناہ کبیرہ اور معافی

سوال: اگر کسی آدمی سے زنا ہو جائے تو آخرت میں اس جرم کی معافی کے لیے اسے دنیا میں کیا کرنا چاہیے؟ (جوناتھن سٹو)

جواب: آخرت میں اس کی معافی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں آدمی لازماً سزا پا چکا ہو، بلکہ محض سچی توبہ اور اصلاح سے بھی یہ آخرت میں معاف ہو سکتا ہے۔

سزا کا نفاذ

سوال: جرم کی سزا پانے کے لیے آدمی کس سے رابطہ کرے تاکہ وہ اس پر سزا نافذ کر دے؟

(جوناتھن سٹو)

جواب: اگر انسان کے کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال دیتا ہے تو خود انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اسے مشہور نہ کرے اور بس اللہ سے سچی توبہ کرے اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لے۔ چنانچہ اسے نہ کسی شخص کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کرنے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اپنے اوپر لازماً سزا نافذ کرانے ہی کی کوئی ضرورت ہے۔

کالے جادو کی شرعی حیثیت

سوال: کیا کسی مسلمان کو سفلی علوم (جادو ٹونے) کے ماہر سے اپنی بیماری یا مصیبت کا علاج کرانا چاہیے؟ (آصف حسین)

جواب: سفلی علوم (جادوٹونے) کے عاملوں سے لازماً بچنا چاہیے، کیونکہ یہ لوگ شیاطین کو خوش کرنے کے لیے کئی طرح کے مشرکانہ اور کافرانہ عمل کرتے ہیں۔ جو لوگ ان سے اپنا کوئی کام کراتے ہیں، وہ دراصل خدا کو چھوڑ کر ان کے شیاطین کی مدد سے اپنا کام کراتے ہیں۔ رہی ان لوگوں کی یہ بات کہ ہم تو اپنا عمل کرتے ہیں، شفا تو اللہ ہی دیتا ہے تو یہ بس ان کے منہ کی بات ہے جو شاید یہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، ورنہ جادو کرنا کرانا تو صریح کفر ہے۔ ان کے اس قول کی مثال یہ ہے کہ کوئی چور بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تو بس چوری کرتا ہوں، رزق تو مجھے اللہ ہی دیتا ہے۔ یقیناً چور اللہ کے اذن ہی سے چوری پر قادر ہوتا اور جادو کرنے والا اللہ کے اذن ہی سے جادو کر پاتا ہے اور اس کا جادو اللہ کے اذن ہی سے کامیاب ہوتا ہے، لیکن اللہ کی رضا اچھے کام کرنے میں ہے اور ناراضی برے کام کرنے میں ہے گو برے کام بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ آپ ان کے اس جملے سے دھوکا نہ کھائیں۔

سورۂ نور کی آیت ۲۶ کا مفہوم

سوال: سورۂ نور کی آیت ۲۶ ''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہوں گے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہوں گے'' اس آیت کے مطابق اس شخص کا کیا معاملہ ہوگا جس نے شادی سے پہلے کسی لڑکی سے محبت کی اور اس کے ساتھ جنسی عمل کے سوا اظہار محبت کے کئی طریقوں کو اختیار کیا۔ کیا ایسا شخص خبیث مردوں ہی کی صف میں آئے گا اور کیا اس کے مقدر میں خبیث عورت ہی ہوگی؟ (عبدالرحمٰن)

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ جس خاتون سے انسان بہت محبت رکھتا ہو، اس کے ساتھ بہت مخلص ہو اور بڑے سچے جذبے سے اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہو، اس کو بھی کسی نسوانی اور جنسی پہلو سے دیکھتے رہنا، چھونا، اس سے اسی نوعیت کی گفتگو کرنا اور اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا وغیرہ، یہ سب دینی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے۔ البتہ جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ آخرت سے متعلق ہے، اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں پر ہو سکتا ہے کسی کو اس کے کیے کی کوئی سزا دی جائے یا نہ دی جائے، لہٰذا آپ جہاں شادی کرنا چاہتے ہیں، وہاں خواہ مخواہ کوئی شک نہ کریں۔ اپنی معلومات کے مطابق تسلی رکھیں اور وہم میں نہ پڑیں۔

حدود آرڈی نینس

سوال: غامدی صاحب کے نزدیک حدود آرڈی نینس کا نیا بل شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ (عاقب خلیل خان)

جواب: غامدی صاحب اس بل سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس بل میں شریعت کی رہنمائی سے شدید انحراف موجود ہے۔ وہ اس بل میں موجود جن باتوں کو شریعت کی رہنمائی سے مختلف محسوس کرتے ہیں، ان میں چند درج ذیل ہیں:

۱۔ اس بل میں مسلم اور غیر مسلم کی گواہی میں اور مرد و عورت کی گواہی میں فرق کیا گیا ہے، ان کے خیال میں یہ چیز شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

۲۔ اس بل کے مطابق زنا کی سزا سو کوڑے اور زنا بالجبر کی سزا موت ہے، جبکہ غامدی صاحب کے نزدیک جرم کی دو نوعیتیں ہیں: ایک اس کی سادہ شکل ہے، جیسے زنا یا چوری اور دوسری وہ شکل ہے جس میں مجرم قانون کے خلاف قوت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس صورت میں زنا، زنا بالجبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور چوری، ڈاکے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک زنا بالجبر کی صورت میں مجرم کو دو سزائیں دی جائیں گی: ایک زنا کی سزا سو کوڑے اور دوسری حرابہ کی سزا جو سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳-۳۴ کے تحت اسے دی جائے گی۔

۳۔ غامدی صاحب کے نزدیک زنا کا مقدمہ رجسٹر کرنے کے لیے چار گواہوں کی شرط لازم ہے، جبکہ اس بل کے مطابق دو گواہوں کے ملنے پر بھی مقدمہ رجسٹر کر لیا جائے گا۔ ایسے کچھ اور اختلافات بھی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے آپ غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' کے باب ''حدود و تعزیرات'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔